حجیتِ حدیث

افادات: محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ
ترتیب وپیشکش: مولانا محمد عمران ولی

محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ہر سال درس بخاری کی ابتدا میں حجیت وتدوین حدیث اور متعلقہ موضوعات پر مدلل ومفصل تقریر فرمایا کرتے تھے، جو بجائے خود علوم حدیث میں حضرت کے وسیع مطالعے کا نچوڑ اور دسیوں اشکالات کا جواب ہوتی تھی۔ پیش نظر مقالہ اسی نوع کی ایک تقریر کا تحریری قالب ہے، جو اس وقت کے درجہ خامسہ کے طالب علم اور بعد کے جامعہ کے استاذ، دارالافتاء کے رکن رکین اور شعبہ تخصص فی الفقہ والدعوۃ والارشاد کے نگران مفتی محمد ولی درویش رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی: ۱۹۹۹ء) کا (بتاریخ: ۲۱ شوال ۱۳۹۲ھ، ۱۹۷۲ء) ضبط کردہ ہے۔ مفتی ولی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی ڈائری سے ہدیۂ قارئین ہے۔

اس زمانہ میں فتنۂ انکارِ حدیث نہایت آب وتاب سے پھیل رہا ہے۔ حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کی طرف سے تین متضاد خیالات اشاعت میں آرہے ہیں:

۱:- ''قرآن مجید کے لیے حدیث شریف کی ضرورت نہیں، ہر شخص اپنی سمجھ سے قرآن مجید سمجھ سکتا ہے، اور روایات واحادیث کا سارا سلسلہ سازش ہے۔'' (پرویز، طلوع اسلام، اکتوبر: ۱۹۵۲ء)

مقصد یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ وبیان کردہ تشریحات قطعاً حجت نہیں، یا قطعاً حاجت نہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ قولِ رسول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی واجب الاتباع نہ تھا۔

۲:- ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام بیان فرمائے ہیں وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ مختص تھے، ہر زمانہ کے مطابق اس میں تغیر وتبدل ہوسکتا ہے۔'' (پرویز، معارف، ج: ۴، ص: ۶۹۲)

جبکہ طلوع اسلام، ماہِ جون: ۱۹۵۰ء، ص: ۴۷، میں یہ ہے کہ: ''آپ علیہ السلام کا فرمان آپ کے زمانہ میں حجت تھا، ہم پر حجت نہیں۔''

۳:- ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل تو حجت ہے، لیکن چونکہ ہم تک باوثوق ذرائع سے نہیں پہنچا،

اس لیے ظنی ہونے کی وجہ سے قابلِ اعتماد نہیں رہا۔'' (پرویز، طلوع اسلام، جولائی، ص:۱۹، ص:۴۹، اسلم جیراج پوری، طلوع اسلام، ماہِ نومبر: ۱۹۵۰ء، ص:۳۰۷)

اگر منکرینِ حدیث کے مختلف گروہوں کے مختلف خیالات ہوتے تو کوئی تعجب نہ ہوتا۔ عجب امر یہ ہے کہ ایک ہی گروہ بلکہ ایک ہی شخص مختلف آراء اور خیالات کا اظہار کر رہا ہے، جسے دیکھ کر دو شقوں میں سے ایک کا تسلیم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، یعنی یا تو ان کو مجبور سمجھ کر معذور خیال کیا جائے یا یوں کہا جائے: ان کا کوئی نصب العین معین نہیں ہے اور نہ ہی کوئی نظریہ، بلکہ اس ساری تگ و دو سے ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ تعلیماتِ رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے انکار کر کے ہر طرح سے آزادانہ زندگی بسر کریں، اس لیے جس قسم کا موقع پاتے ہیں بات منہ سے نکالتے ہیں، اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس سے پہلے کیا بک چکے ہیں۔

ہم قبل ازیں ان کا پول کھولنے کے لیے مختلف مضامین بذریعہ اخبارات ورسائل شائع کر چکے ہیں، جن میں سے بعض مضامین کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس وقت ہم مختلف قسم کے تین نظریوں سے بالاختصار بحث کرنا چاہتے ہیں:

نظریۂ اولیٰ کی تردید

۱:-''وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْمِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَايَشَاءُ''۔ (الشوریٰ:۵۱)

اس آیت میں اِرسالِ رسول کے مقابلہ میں ذکر کرنا دال ہے کہ بغیر ارسالِ رسول کے بھی وحی ہوتی ہے، یہی حدیث ہے۔

۲:-''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا''۔ (البقرۃ:۱۴۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بیت المقدس کی طرف استقبال کا حکم الٰہی تھا، حالانکہ قرآن مجید میں یہ حکم مذکور نہیں۔

۳:-''عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ أَنْفُسَكُمْ''۔ (البقرۃ:۱۸۷)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں رمضان کی رات کو بھی جماع کرنا حرام تھا، یہ حرمت حدیث ہی سے ثابت تھی، قرآن مجید میں اس کا حکم نہیں۔

۴:-''وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ''۔ (آل عمران:۱۲۳)

یہ آیت جنگِ احد کے موقع پر نازل ہوئی، جس میں مذکور ہے کہ بدر کے مقام پر خداوند کریم نے انزالِ ملائکہ کا وعدہ کیا، حالانکہ قرآن مجید میں مقام بدر پر اس قسم کا کوئی وعدہ مذکور نہیں، تو معلوم ہوا

کہ انزالِ فرشتہ وحیِ غیر متلو سے تھا جو کہ حدیثِ رسولؐ ہے۔

۵:- قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام کی احادیث ہیں جو حجیت حدیث پر واضح دلیل ہیں، جب انبیاء کرام سابقین علیہم السلام کی احادیث کا ان کی امت پر واجب الاتباع ہونا ثابت ہوتا ہے، تو پھر ہمارے رسول کریم ﷺ کی احادیث کیونکر واجب العمل نہ ہوں گی؟

۶:- قرآن مجید میں جابجا ''أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ'' کا ارشاد ہے۔ اگر نبی علیہ السلام کا قول وفعل قابل اعتماد نہیں تو ''أَطِيعُوا الرَّسُولَ'' جابجا کیوں مذکور ہے؟ قرآن مجید میں جابجا اطاعتِ رسولؐ کی تاکید کی گئی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی پر وعید شدید سنائی ہے۔

۷:- ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔'' (آل عمران:۱۶۴)

یہ آیت معنی اور مفہوم کے اعتبار سے قطعی طور پر محکم ہے۔ اس میں صاف دلالت ہے کہ رسول کریم ﷺ کا کام ڈاک کے ہرکارے کی طرح ابلاغ ہی نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ حکمت کے مبلغ اور مسلمانوں کے لیے مزکّی بھی تھے۔ تعلیم الکتاب کا جو فرض حضور ﷺ کے ذمہ لگایا گیا تھا آپ ﷺ اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے؟ کیا قرآن کریم کے طلبہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کریم کی کسی آیت کے بارے میں آپ علیہ السلام سے دریافت نہ کرتے تھے؟ اور اگر دریافت کرتے تھے تو کیا آپ ﷺ ان کے جواب میں قرآن ہی کی آیت پیش فرمایا کرتے تھے؟ کیا یہ طریقِ تعلیم قرینِ قیاس ہوسکتا ہے کہ ایک معلم کسی کتاب کی تعلیم دے اور طلبہ سماعِ متن کے علاوہ کوئی اور بات دریافت کریں تو استاذ ان کے جواب میں کتاب کا ہی متن پڑھ دے اور اپنی زبان سے تشریح کچھ نہ کرے؟ معلم کا فرض ہے کہ کتاب کی مجملات کی تفسیر واضح طور پر سمجھائے، طلبہ کے اعتراضات اور خدشات کو حل کرکے کتاب کے مفہوم اور معنی کو واضح کردے اور اچھی طرح سمجھائے۔

اگر قرآن کریم سمجھنے کے لیے حدیث کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ ہر شخص اپنے دماغ سے قرآن سمجھ سکتا ہے تو پرویز علیہ ما علیہ نے معارف القرآن لکھ کر حماقت کا ثبوت کیوں دیا؟ حضور علیہ السلام کی تفسیر تو قابل قبول نہ ہو اور گستاخ خاک بدہنش کی تفسیر مقبول ہو۔ حضور علیہ السلام اپنے قول وفعل سے تشریح وتفسیر فرماتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تا زندگی تزکیہ کرتے تھے اور اگر حضور علیہ السلام کا قول وفعل قابل اعتماد نہیں تو پھر آپ علیہ السلام معلم الکتاب اور مزکّی کیسے ہوئے؟

۸:- قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعۂ خواب مذکور ہے، جو کہ وحی متلو (میں موجود) نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہزار تمناؤں کے بعد آخری عمر میں خداوند قدوس نے فرزند عزیز

عطا فرمایا، پھر حالت رضا میں برسوں تک اکلوتے بیٹے کو وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ کر فراق کے صدمے دریافت کیے، مگر خلیل اللہ علیہ السلام کے مقامِ تسلیم رضا کی امتحان کی ایک شدید ترین گھاٹی تا حال باقی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خواب کو وحی الٰہی فرما کر بغیر کسی تردد کے حکم کی تعمیل کے لیے نہ صرف آمادہ ہوجاتے ہیں، بلکہ فرزند لختِ جگر کو قربانی فرمانے کا عمل نہایت مستعدی سے شروع کردیتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نہایت عزیز ترین اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا اقرار کرنا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ''فَافْعَلْ مَاتَرٰی '' کے بجائے ''فَافْعَلْ مَا تُؤْمَرُ '' اور اللہ تعالیٰ کا ''قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا '' اور ''فَدَیْنَاہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ '' کا ارشاد فرمانا، پھر اس امتحان کو ''بَلَاءٌ مُّبِیْنٌ '' سے تعبیر کرنا یہ جملہ اس بات کے لیے واضح دلیل ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں ذبح کرنے کا حکم ہوا، اور وہ حکم واجب العمل بھی تھا، غرض یہ کہ حجیت حدیث پر آیات بالا قطعی دلیل ہیں، اس کے بعد کچھ عقلی دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔

دلائلِ عقلیہ

۱:..... قرآن مجید میں ہر شئے کا ذکر اجمالاً ہے، جس کی تشریح اور تفسیر احادیث میں ہے۔ نمازوں کے اوقات، تعدادِ رکعات، واجبات کی تفصیل، صوم وصلاۃ کے معاملات اور معاشرت کے احکام وقوانین ان سب امور کی تفصیل حدیث شریف میں ہے اور حدیث ہی سے ثابت ہے۔ پس انکارِ حدیث سارے نظام اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح پیشاب، پاخانہ، کتا، گوہ، گیدڑ وغیرہ کی حرمت کا ذکر قرآن مجید میں نہیں، چنانچہ اسی اعتراض سے بچنے کے لیے منکرین حدیث علیہم ما علیہم ان جملہ اشیاء کی حلت کے قائل ہیں۔

محمد صبیح ایڈوکیٹ لکھتے ہیں:

''قرآن میں مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ باقی ہر چیز کا کھانا فرض ہے اور کھانے سے انکار کرنا گناہ ہے اور خدا تعالیٰ کی معصیت ہے۔'' (طلوع اسلام، جون: ۱۹۵۲ء)

یعنی کتا، گیدڑ، بلی، چوہا حتیٰ کہ پیشاب پاخانہ کا کھانا فرض ہے۔ (**نعوذ باللّٰہ من تلک الخرافات**) اس سے ظاہر ہے کہ منکرین حدیث خدا کی معصیت سے بچنے کے لیے شبانہ روز انہ یہ اشیاء کھاتے ہوں گے۔ (**سَوَّدَ اللّٰہُ وُجُوْھَھُمْ**)

۲:..... اگر احادیث کے راوی قرآن کے خلاف عجمی سازش کرنے والے تھے، اس لیے حدیث قابل قبول نہیں تو قرآن بھی انہی وسائل سے ہم تک پہنچا ہے، قرآن پر کیسے اعتماد کرسکتے ہیں؟ (العیاذ باللہ) اگر کہا جائے قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ '' تو ہم کہتے ہیں: خود اس آیت کی صداقت پر کیسے اعتماد ہوگیا؟ کیونکہ یہ بھی انہی لوگوں کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے، جن کی

وساطت سے ہم تک احادیث پہنچی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن حکیم کا اعجاز فی البلاغۃ اس کی صداقت پر دال ہے، اول: تو قرآن کا معجز ہونا من حیث البلاغۃ مختلف فیہ ہے، بعض نے اعجاز عن الغیب وغیرہ کا قول کیا ہے، جس کی صداقت وتصدیق مذکورہ وسائط کے ذریعہ سے معلوم اور منقول ہے۔

ثانیاً: قلیل تغیر اور بعض مواقع پر ترتیب کی تبدیلی سے اعجاز فی البلاغۃ میں بظاہر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، اس پر مختصر المعانی میں بحث کی گئی ہے۔

ثالثاً: اعجاز فی البلاغۃ معیارِ حق تب ہوگا جبکہ تحدی ثابت ہو اور آیاتِ تحدی آیت مذکورہ سے بھی ثابت ہے۔

رابعاً: تحدی من حیث البلاغۃ موجودہ زمانہ میں معیار صداقت نہیں ہوسکتا، کیونکہ تحدی اس چیز کی مفید ہوگی، جس کا دنیا میں بہت زور اور چرچا ہو، ظاہر ہے کہ دورِ حاضر میں بلاغت کی نسبت علم سائنس کا بہت چرچا ہے، پس بلاغت کا لحاظِ تحدی مانۂ تنزیل کے ساتھ مخصوص ہوگی، اس وقت میں اہل بلاغت کی مثل سے عاجز نہیں، بلکہ بلاغت کے مشہور دور میں بڑے بڑے بلغاء اس کی مثل سے عاجز رہے۔ صحابہ کرامؓ وتابعین وتبع تابعین ومن بعدہم امت مسلمہ جو حدیث کو حجت تسلیم کرتے ہیں، کیا ان سے اجتہادی غلطی ہوئی؟ یا یہ جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے؟ اگر اجتہادی غلطی ہوئی ہے، یعنی حدیث قابل حجت نہیں تھی، مگر اسلاف سے غلطی ہوئی کہ وہ اسے قابل عمل سمجھتے رہے، تو یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ ساری امت کے متقدمین ومتأخرین وصلحاء تمام تر اسلاف اسی غلطی میں رہے، کیا کسی ایک فرد نے اس غلطی کو محسوس نہیں کیا ہے؟ اور اگر اسلاف حدیث کو قابل عمل نہیں سمجھتے تھے، تو کیا جان بوجھ کر حدیثیں بیان کر کے قرآن کے خلاف سازشیں کرتے رہے؟ تو اس امت میں باقی مؤمن کون رہا؟ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ وتبع تابعینؒ، ائمہ محدثینؒ اور جمیع سلف صالحینؒ تو نعوذ باللہ قرآن کے خلاف تھے، اور صرف شیطان پرویز ہی چودہ سو سال کے اندر قرآن سمجھنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ اور جو دین چودہ سو سال تک مخالفین کے پاس رہا، اتنی طویل مدت تک اس کا کوئی محافظ اور اُسے قبول کرنے والا پیدا ہی نہیں ہوا، تو ایسے دین پر کیونکر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سابقہ آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطہ سے کیوں اتارا؟ اگر اللہ تعالیٰ ہر فرد بشر کے پاس لکھی لکھائی کتاب بلا واسطۂ رسول بھیج دیتے تو لوگ صریح معجزہ ہونے کی وجہ سے زیادہ متأثر ہوتے اور کفار خود اس بات کے طالب بھی تھے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر لکھی لکھائی کتاب نازل کی جائے۔

سو اگر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تو منہ مانگا معجزہ ملنے پر زیادہ سبب ہدایت ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا اور رسولوں کی معرفت کتابیں بھیج دیں۔ اور رسول بھی صرف انسانوں میں سے

منتخب فرمائے۔ کفار کہتے تھے کہ پیغام پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ آسمان سے فرشتہ کیوں نہیں اتارتا؟ تاکہ ہمیں احکام کے منزل ہونے کا یقین ہو جائے، اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ''لَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا'' (الانعام:۹) ''لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُوْلاً'' (بنی اسرائیل:۹۵) غرض یہ کہ تنزیل کتب کے لیے رسولوں کو واسطہ بنانے اور رسالت کے لیے منتخب کرنے پر اس قدر اصرار کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب ضرور کتاب اللہ میں موجود ہے: ''وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ''۔ (النساء:۶۴) یعنی خدا تعالیٰ نے جتنے رسول بھیجے، ان کی بعثت کا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ فرمان خداوندی عزوجل کے مطابق حکم دیں اور خود قوانین الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کریں اور نازل شدہ احکام پر عمل کر کے امت کے لیے ایک نمونہ قائم کریں، تاکہ امت ان کی تابعداری کرے۔ اور اگر بلا واسطۂ رسول احکام نازل کیے جاتے اور ان کی تفسیر و تفصیل کرنے والا کوئی نہ ہوتا اور ان کو عملی جامہ پہنانے والا کوئی نہ ہوتا تو لوگ آیات کے مفہوم اور معانی میں اختلاف کرتے اور منشأ الٰہی کو سمجھنے میں غلطی کرتے، ان کو سمجھانے والا کوئی نہ ہوتا۔

اس ضرورت کو کسی حد تک فرشتے بھی پورا کر سکتے تھے، مگر ان کے متعلق لوگ خیال کرتے کہ فرشتہ قوتِ نفسانی، شہوانی اور غضب سے منزہ ہے اور انسانی حوائج و ضروریات سے مستغنی ہے، اس سے احکام طہارت، پاکیزگی اور تقویٰ میں انسان فرشتہ کی پیروی نہیں کر سکتے، کیونکہ انسان پیٹ رکھتا ہے، کھانے پینے سے پیشاب پاخانہ کرنے کا محتاج ہوتا ہے، قوت شہوانی و غضب کا مالک ہے اور وامراض و عوارض کا شکار رہتا ہے، بال بچوں کا جنجال ہوتا ہے، اس لیے فرشتہ کا اتباع انسان کے بس کی بات نہیں، لوگ کہہ سکتے تھے کہ ہم انسان ہیں، ہم میں انسانی کمزوریاں ہیں، ہم فرشتہ کی متقیانہ زندگی کا اتباع نہیں کر سکتے، اس لیے ضروری تھا کہ انسان ہی جذبات و عوارض کے ساتھ بطور پیغمبر مبعوث فرمایا جائے، اس کے لیے وہی معاملات درپیش ہوں جو عام انسانوں کو درپیش ہوں، تاکہ وہ قوانین الٰہیہ کے مطابق لوگوں کو زندگی بسر کر کے دکھائے کہ دیکھئے! انسان کس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے فعل، عمل اور قول سے ہدایت دیتا اور اس کو سمجھاتا ہے، تاکہ انسانی زندگی کی پیچیدہ راہوں سے بچ کر راہ مستقیم پر چل سکے۔ غرض یہ کہ لفظوں میں منزلہ احکام کو عملی جامہ پہنا کر امت کے لیے اسوۂ حسنہ قائم کر دیتا ہے، بس یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ پیروی رسولؐ کو بھی اس کے ساتھ ہم پر لازم فرما دیا۔

نظریۂ ثانیہ کی تردید

اگر رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات صرف آپ علیہ السلام کے زمانہ کے ساتھ خاص تھیں اور حجت نہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت قیامت تک عام نہیں۔ (حالانکہ) یہ (نتیجہ) غلط ہے، جبکہ مندرجہ ذیل آیات اور ادلہ بھی اس کی صریح تردید کرتی ہیں:

۱:- ''أَطِيعُوا الرَّسُولَ'' میں قرآنی حکم عام ہے اور قیامت تک کے لیے ثابت رہے گا، اگر ہم پر قرآن حجت ہے تو قرآن کریم کی آیت مقدمہ کا ٹکڑا ہم پر کیوں حجت نہیں ہوگا؟

۲:- ''يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا''۔ (الاعراف:۱۵۸)

۳:- ''وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ''۔ (الانبیاء:۱۰۷)

۴:- ''وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُونَ''۔ (السبأ:۲۸)

۵:- ''مَاكَانَ مُحَمَّدٌأَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ''۔ (الاحزاب:۴۰)

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ کتاب اللہ کے سمجھنے کے لیے معلم کی ضرورت ہے، جب نبی کریم علیہ السلام کے بعد کوئی نبی و رسول نہیں آ سکتا، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی تعلیمات الی القیامہ واجب الاتباع ہیں۔

۶:- ''رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّايَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ''۔ (النساء:۱۶۵)

دلائل عقلیہ

۱:- کتاب اللہ کے سمجھنے کے لیے معلم الکتاب کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو رسول کیوں مبعوث کیے گئے؟ نیز اگر قول رسولؐ اہل زمانہ پر واجب الاتباع ہے تو ہم ان تعلیمات سے کیسے مستغنی ہو سکتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلم کی ضرورت پڑے اور ہم معاذ اللہ ان سے بھی زیادہ عقلمند بن بیٹھے، کہ وہ باوجود اہل زبان، اہل محاورات ہونے کے نہ سمجھ سکے اور ہم سمجھنے لگ گئے۔

۲:- تمام جمہور یعنی جمیع امت جو آج تک حدیث کو قابل قبول سمجھتی آئی ہے، ان سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے یا جان بوجھ کر بقول پرویز: ''اسلام کے خلاف سازش کرتے رہے ہیں''۔

نظریۂ ثالثہ کی تردید

۱:- منکرین حدیث کہتے ہیں کہ: حدیث ظنی ہے، قرآن کی رو سے ظنی پر عمل کرنا جائز نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کریم کی رو سے حدیث کی پیروی کرنا منع ہے۔ منکرین حدیث کا یہ استدلال دجل وتلبیس ہے کہ لفظ ظن لغوی معنیٰ میں مستعمل ہے یا بالکل بغیر دلیل کے محض گمان اور اٹکل ہے۔

۲:- شواہد اور قرائن سے ظن بمعنی غالب ہے۔

۳:- نیز علم یقینی، نظری استدلالی ہے جو برہان قطعی سے حاصل ہو اور اس میں مشاہدہ بھی ہو، مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ میں لفظ ''ظن'' اس علم یقین کے معنی میں مستعمل ہے اور رکھا گیا ہے:

۱:- ''یَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔'' (البقرۃ:۴۶)

۲:- ''قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا اللّٰهِ۔'' (البقرۃ:۲۴۹)

۳:- ''وَظَنَّ دَاوٗدُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّأَنَابَ۔'' (ص:۲۴)

۴:- ''أَلَا يَظُنُّ أُولٰئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ۔'' (المطففین:۴)

قرآن کریم نے ظن بمعنی اٹکل استعمال کرنا منع کیا ہے۔

احادیث کا سلسلہ (معاذ اللہ) محض اٹکل نہیں ہے، اس لیے ظن کا معنی ثانی یعنی غالب و معنی ثالث یعنی علم یقینی استدلالی ہے اور ظن کو اسی لحاظ سے ظن کہا جاتا ہے، بہت ساری احادیث علم یقینی واستدلالی کا فائدہ بھی دیتی ہیں۔

حضرت علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی:۸۵۲ھ) شرح نخبۃ الفکر میں فرماتے ہیں:

''وقد يقع فيها أي في أخبار الآحاد المنقسمة إلى مشهور وعزيز وغريب ما يفيد العلم النظري بالقرائن على المختار۔'' (شرح نخبۃ الفکر، ص:۳۴، ط:قدیمی)

تو صاف ظاہر ہے کہ واجب الاتباع ہیں۔ باقی رہیں وہ احادیث جو ظن غالب کا فائدہ دیتی ہیں، سو شریعت مطہرہ نے ظن کو یقین کا فائدہ دے کر واجب الاتباع قرار دیا ہے۔ شرعی یقین کے لیے ثقہ عادل کی شہادت کہیں ایک، کہیں دو اور کہیں زیادہ کی کافی ہے، سو وہ احادیث میں موجود ہیں، اس لحاظ سے سب احادیث یقینی ہیں، اس لیے کہا جاتا ہے کہ مفیدِ علمِ یقینی واستدلالی ہیں۔ یا یہ کہ اکثر احادیث میں عقلاً احتمال موجود ہے، لیکن شرعاً نہیں۔ غرض یہ کہ نتیجہ یہی ہوگا کہ مفیدِ علمِ یقینی واستدلالی شرعی ہیں اور عقلاً اس لیے کہا جاتا ہے کہ بعض احادیث مفیدِ علمِ یقینی استدلالی عقلی ہیں۔ اور اکثر احادیث موجب ظن غالب ہیں اور دنیا میں ظن غالب پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ہم رات اور دن اپنے تمام معاملات میں ظن غالب پر ہی عمل کرتے ہیں، مثلاً: دوا پینے کے وقت شفاء کا یقین نہیں، بلکہ مضرت کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ ریل، طیارہ، بحری جہاز وغیرہ پر سوار ہوتے وقت ان کی مشینری کا کوئی علم نہیں ہوتا کہ آیا یہ درست ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ راستے کے حوادث سے محفوظ رہنے کا بھی یقین نہیں ہوتا، بلکہ ان تمام صورتوں میں طیارہ گرنے، یا ریل کے پٹری پر سے اتر جانے اور بحری جہاز کے سمندر میں غرق ہوجانے کا احتمال بھی ہوتا ہے، باوجود ان احتمالات کے ہم رات دن انہی ذرائع کے ذریعہ سفر کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بازار سے دودھ، گھی خریدتے وقت، غسل، وضو کرتے وقت ان کی طہارت کا کامل یقین نہیں ہوتا اور نہ ہی ہوسکتا ہے۔ ان تمام معاملات میں ظن غالب پر عمل کیا جاتا ہے۔ اگر بالفرض ظن غالب کی پیروی

کو ترک کر دیا جائے تو انسان کا دنیا میں زندہ رہنا محال ہو جائے گا۔

ان معاملات کے علاوہ چند اور مثالیں بھی دیکھ لیں کہ سانپ کے کاٹنے کے بعد مرنے کا یقین نہیں ہوتا، سانپ کے پاس جانے کے وقت کاٹنے کا یقین نہیں، زہر پینے کے بعد موت کا یقین نہیں ہوتا، باہمہ ہذا زہر سے بچتے ہیں، سانپ سے پرہیز کرتے ہیں، ان سب پر ظن غالب ہی کی وجہ سے عمل کرتے ہیں، تو کیا ہم پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ اے گروہِ منکرین حدیث! جب ہم زندگی کے ہر معاملہ میں ظن غالب پر یقین رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ حدیث کو ظنی ہونے کی بنا پر چھوڑ دیا جائے؟!!!

یاد رکھئے! قرآن مجید یقینی ہے اور حدیث ظنی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ حدیث کو محض اٹکل سمجھ کر ناقابل اعتماد قرار دیا جائے۔

سنئے! قرآن کے یقینی اور حدیث کے ظنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا ہر لفظ تواتر سے ثابت ہے، اس لیے یقینی و بدیہی ہے، اور حدیث میں چونکہ روایت بالمعنی جائز ہے، اس لیے اس کے ہر لفظ کے بارے میں قرآن جیسا یقین نہیں ہوسکتا، لہٰذا حدیث یقینی استدلالی و یقینی شرعی ہے، جیسے کہ ماں (والدہ) کا علم یقینی اور باپ (والد) کا علم ظنی ہوتا ہے، کیونکہ والدہ کے بارے میں یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے، مگر باپ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا باپ کا علم یقینی شرعی ہے۔

دلیل عقلی

جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ قول رسولؐ قیامت تک واجب الاتباع ہے، مگر حدیث کا موجودہ ذخیرہ حجت نہیں، اس لیے کہ ظن ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے جب تعلیمات رسولؐ کو قیامت تک ہمارے لیے واجب الاتباع قرار دیا ہے، تو اللہ پاک نے ان کی حفاظت کا بندوبست کیوں نہ کیا ہوگا؟ کیا یہ تکلیف مالا یطاق اور امت پر ظلم نہ ہوگا کہ ان اقوال کی اتباع ہم پر واجب کر دی گئی جن کی تحصیل ہم پر ناممکن ہے۔ غرض یہ کہ قول رسولؐ کو واجب الاتباع تسلیم کر لینے کے بعد اسے ظنی سمجھتے ہوئے حجت نہ ماننا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم کی نسبت کرنے کے مترادف ہے۔

منکرین حدیث کا یہ اعتراض

منکرین حدیث کا یہ اعتراض کہ حدیث رسولؐ تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی ہے، صاف دھوکہ ہے، کیونکہ حدیث رسولؐ کی تدوین عہد رسالت ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کا کتابت حدیث سے منع فرمانا اسلام کے ابتدائی زمانہ میں صرف اس لیے تھا کہ کہیں قرآن کے ساتھ التباس نہ ہو جائے، کیونکہ اس وقت کتابتِ قرآن کا دستور تھا اور عوام قرآنی اسالیب اور اس کے معجز ہونے سے

ابھی پوری طرح فائز و واقف نہ تھے۔ کتابتِ حدیث سے منع کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ حدیث قابل اعتبار نہیں، اگر یہ مقصود ہوتا تو آپ ﷺ حدیث بیان کرنے سے روک دیتے، حالانکہ حضور ﷺ نے خود فرمایا: ''فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ '' حضور ﷺ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں احادیث بیان کرنے کا رواج تھا، جناب نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ایک خدمت پر بھیجتے وقت دریافت فرمایا کہ: تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلے قرآن پر نظر کروں گا، پھر آپ کے قول اور فعل سے استدلال کروں گا، پھر اجتہاد سے کام لوں گا۔ حضور ﷺ نے اس پر اظہارِ مسرت فرمایا اور حدیث کے حجت (ہونے) پر تصدیق ثبت فرمائی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تسمعون ویسمع منکم ویسمع ممن یسمع منکم '' (سنن ابوداود، کتاب العلم، باب فضل نشر العلم، ج:۲،ص:۱۵۹) شروع میں اگرچہ عوام کو اختلاط بالقرآن کی وجہ سے اجازت نہ تھی، تاہم خاص خاص لوگوں کو کتابت کی اجازت تھی۔

طبقات میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکورہ ہے کہ آپؓ نے دربارِ رسالت میں عرض کیا کہ: یارسول اللہ ﷺ! میں نے آپ سے جو احادیث بالمشافہ سنی ہیں، ان کے تحریر کرنے کی اجازت عطا فرمادیجئے! آپ ﷺ نے بخوشی اجازت عطا فرمادی، پھر آپؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ: یارسول اللہ! کیا میں نشاط کی احادیث ضبط کروں یا غصہ کے وقت کی بھی؟ آپ ﷺ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: اس منہ سے سوائے حق کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ چنانچہ احادیث کو انہوں نے جمع کیا اور اس کا نام ''الصادقة'' رکھا۔ یہ پورا واقعہ ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب العلم'' میں بھی لکھا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے سب سے زیادہ احادیث یاد ہیں، مگر عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ لکھا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا: ''إنهٗ كان يكتب ولا أكتب''۔

بخاری شریف اور مستدرک حاکم سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی احادیث کا ذخیرہ مکتوبہ موجود تھا۔

حضرت حسن بن عمرؒ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو حدیث سنائی تو آپؓ نے فرمایا کہ: یہ غلط ہے اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر یہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو تحریری کتابوں میں ضرور درج ہوگی، چنانچہ آپؓ نے اپنی کتابوں میں یہ حدیث تلاش کی تو یہ حدیث مل گئی، اس مقام پر منکرین نے دو اعتراض کیے ہیں:

اعتراض اول:..... بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے زیادہ روایات منقول نہیں۔

جواب:.....اس کا جواب یہ ہے کہ بخاری شریف کی روایت میں استثناء منقطع ہے، اس لیے سابقہ جملہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ نیز کثرتِ علم، کثرتِ روایت کو مستلزم نہیں۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ زیادہ تر شام میں رہے ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قیام مدینہ منورہ میں رہا، چونکہ دورِ اول میں علم کا مرکز مدینہ منورہ تھا، لوگ تحقیق مسائل میں مدینہ منورہ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، اس لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو روایات زیادہ بیان کرنے کا موقع ملا۔

اعتراض دوم:.....مستدرک حاکم میں موجود ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی لکھی ہوئی احادیث موجود تھیں اور بخاری میں ہے: ''لا أكتب''۔

جواب:.....اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ خود لکھنا نہ جانتے تھے، بلکہ دوسروں سے لکھواتے تھے۔ (فتح الباری، ج:۱،ص:۸۳۰) جب لوگ قرآن مجید کے معجزانہ اسلوب سے خوب واقف ہو گئے، تو آپ ﷺ نے لکھنے کی اجازت عطا فرمائی، بلکہ لکھنے کا حکم عطا فرمایا اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دینی مسائل اور پیغمبرانہ ہدایات خود لکھوائیں۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور ابو شاہ یمنی کی درخواست پر وہ خطبہ لکھوا کر خود انہیں دے دیا، فرمایا تھا: ''**اكتبوا لأبي شاه**'' (مفتاح السنۃ، ص:۱۷۰، طبع مصری) اور بخاری شریف میں ایک حدیث ہے، فرمایا کہ حضرت عمرو بن حزمؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ ﷺ نے انہیں ایک مفصل تحریری ہدایت نامہ بھیجا تھا، جس میں صدقات و فرائض وغیرہ کے احکام تھے۔ (مفتاح السنۃ، ص:۱۷۰، طبع مصری)

حضرت مسلم بن حارث رضی اللہ عنہ کے والد کو بشارت لکھوا دی (ابوداود)

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب العلل'' میں لکھا ہے کہ طائف کے ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ان کی ایک کتاب سنائی، خطیبؒ کی روایت کے مطابق حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس بھی احادیث کا مجموعہ تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنی اولاد کو کتابتِ حدیث کا حکم دیا کرتے تھے۔ (دارمی، ص:۶۸)

ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے جامع میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب دکھا کر قسم کھائی اور کہا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض احادیث کو لکھ کر صحیفہ کی صورت میں اپنے پاس رکھا۔ (بخاری شریف)

بعض کثیر الروایہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ وغیرہم کی روایات کو ان کے شاگرد روبرو بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔ (دارمی۔ تہذیب، ج:۴۔ ترمذی، کتاب العلل) حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمالِ حکومت کے لیے ''صدقۃ المواشی'' کے احکام لکھ کر رکھتے تھے۔ (المؤطا، ص:۱۳۵، ط:مصر یا ص:۱۳۶ یا ص:۱۵۱ یا ص:۱۵۲ پر اس قسم کی مثالیں ملاحظہ فرمالیں)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اگرچہ کتابتِ حدیث ثابت ہے، مگر اس زمانہ میں حفظِ صدری پر زیادہ زور تھا۔ عرب کے لوگ زیادہ مشہور تھے، مختلف مضامین کے طویل وعریض قصائد اُن کو زیادہ یاد تھے۔ نیز اس کے علاوہ ان لوگوں کو اونٹوں کے، گھوڑوں کے زیادہ تر نسب نامے بھی یاد تھے۔ حضور ﷺ کے قول وفعل کو ان لوگوں نے خصوصیت سے وحی الٰہی سمجھ کر حفظ کیا، اور حضور علیہ السلام کے قول وفعل کو واجب الاتباع سمجھ کر اس کی حفاظت کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعینؒ کا زمانہ آ گیا، انہوں نے اقوالِ رسول ؐ کو دنیائے اسلام کے بعید سے بعید گوشہ میں کمالِ حفاظت سے پہنچا دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس ذاتی یادداشتیں تحریر شدہ تھیں، مگر کوئی کتاب حدیث کی مرتب نہ تھی۔ پہلی صدی کے آخر میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۱۰۱ھ) والیِ مدینۃ المنورۃ نے حضرت ابوبکر بن حزم رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا: ''انظر ما کان من حديث رسول اللّٰهؐ، فاكتبوه، فإني خفت دروس العلم وذهاب العلماء'' (مفتاح السنۃ ص:۲۰) اور انہیں یہ بھی لکھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہؒ (متوفاۃ: ۹۸ھ) اور قاسم بن محمد بن ابی بکرؒ (متوفی: ۱۲۰ھ) کی احادیث کے مجموعے لکھوا کر میرے پاس بھجوائیں۔ اسی طرح آپؒ نے آکر بڑے بڑے شہروں کے عمال کو اسی طرح کے حکم تدوینِ حدیث کے لیے بھیجے۔ وصلی اللّٰہ علی النبی الکریم

www.banuri.edu.pk